تہذیبِ جدید اور مُسلمان

ڈاکٹر احمد امین مرحوم ☆ ترجمہ : محمد سرور

تہذیب جدید مسلمانوں کے تمام ملکوں میں، ان میں سے ہر ایک ملک کی استعداد کے مطابق سرایت کر چکی ہے۔ مادی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ تارگھروں اور ریڈیو کی شکل میں بھی اور دستورِ سلطنت کی صورت میں بھی۔ شروع شروع میں یہ سب کچھ شعوری اور اختیاری طور پر نہیں ہوا۔ مسلمان گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے کہ اس تہذیب نے ان پر دھاوا بول دیا۔ اور جب توپوں کی دندناہٹ سے ادبدا کر انھوں نے آنکھیں کھولیں۔ تو یہ تہذیب ان پر حملہ آور ہو کر ان کے شہروں، ان کی حکومتوں اور ان کی ہر چیز میں داخل ہو چکی تھی۔ اب ان کے اربابِ فکر نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس تہذیب کے معاملے میں ان کا کیا موقف ہونا چاہئے۔ کیا وہ اسے اجازت دیں کہ وہ پوری طرح ان ملکوں میں داخل ہو جائے یا اسے وہ بالکلیہ داخل ہونے سے روک دیں۔ یا اس سلسلہ میں وہ کچھ اور کریں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے معاملے میں ان ملکوں کے مصلحین تین گروہوں میں بٹ گئے۔

مثال کے طور پر مصطفےٰ کمال نے اس تہذیب کو مکمل طور پر، مادی و معنوی اعتبار سے گھریلو زندگی کی تنظیم، پارلیمنٹ کی تشکیل اور اس کے لئے دستور کی ترتیب، قانون مدنی (سول) قانون فوجداری، نکاح طلاق، وراثت اجتماعی و اقتصادی نظام، یہاں تک کہ سر کے لئے ہیٹ اور رسم الخط میں لاطینی حروف - سلطنت عثمانیہ کے باشندوں میں منتقل کرنا مناسب سمجھا۔ اور ہندوستان کے گاندھی جی کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ انھوں نے تہذیب جدید اور جن امور پر بھی وہ مشتمل ہے، سب کی مخالفت کی۔ اور اپنی ہندو قوم کو دعوت دی کہ وہ اپنے ہاتھ سے سوت کاتیں اور اس سے کپڑا بنائیں تاکہ ان کا انگلستان کے کارخانوں واقع لنکاشائر سے ربط نہ پڑے۔ اور اس طرح سے شراب نوشی اور لہو و لعب میں جو موجودہ تہذیب کی خصوصیات ہیں ان میں عام نہ ہوں۔ گاندھی جی اپنے اس اصول پر سختی سے جمے رہے اور اپنی قوم کو برابر اس کی دعوت دیتے رہے لیکن تہذیب جدید کا دھارا ان کو بہا لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کی قوم نے اپنے اکثر معاملات میں تہذیب جدید کو قبول کر لیا اور وہ خود بھی اس سے نہیں

بچے۔ وہ انگریزی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ عینک کا جو نئی تہذیب کی ایجاد ہے، استعمال کیا کرتے تھے۔ لیکن مصلحین کے ایک گروہ کی رائے یہ ہوئی کہ اس معاملے میں اخذ و انتخاب کی روش ٹھیک رہے گی۔ تہذیب جدید کی بعض صالح چیزوں کو اختیار کر لیا جائے۔ اور اس کی مضرت رساں چیزوں سے بچا جائے۔ اور اس طرح پرانی تہذیب میں جو اچھی چیزیں ہیں، ان کو قائم رکھا جائے۔ کیونکہ نہ ہر نئی چیز نفع بخش ہوتی ہے اور نہ ہر پرانی چیز مضرت رساں ہے۔ پرانی تہذیب میں بعض چیزیں ایسی ہیں۔ جو تہذیب جدید سے کئی درجے بہتر ہیں۔ مثال کے طور پر اس میں کیا حرج ہے اگر ہم پرانی تہذیب سے رواداری، روحانی غور و تامل کی عادت اور فیاضی باقی رکھیں۔ اور نئی تہذیب سے علم اور سائنس کی اساس پر زندگی کی تعمیر کا رجحان اور آزادیٔ فکر وغیرہ لے لیں۔ اگر ہم اس مسلک پر گامزن ہوں گے تو ہم ایک ایسی تہذیب کو اپنا سکیں گے۔ جو قدیم و جدید دونوں تہذیبوں سے بہتر ہو گی۔ اس میں قدیم و جدید دونوں کی اچھائیاں ہوں گی۔ اور ان میں سے ہر ایک کے شر و فساد سے یہ بری ہو گی۔

بے شک اس طریق کار کو بہت سے لوگوں نے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس ضمن میں ہم مسلمانوں کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض معاملات میں جیسے کہ زراعت، تعلیم اور نظام عدالت ہیں، یہ طریقہ اختیار کیا چنانچہ کبھی تو وہ اپنے مدارس میں ان علوم کو یورپی طریقہ پر پڑھاتے ہیں۔ اور کبھی وہ ان کی تعلیم کے لئے قرون وسطیٰ کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کبھی تو وہ زراعت میں جدید ترین آلات سے کام لیتے ہیں اور کبھی رہٹ، پکھال اور تقدیر پر آسرا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک طرف شرعی عدالتیں ہیں۔ اور دوسری طرف فوجداری اور مدنی قانون کی قومی عدالتیں ہیں۔ ان میں سے بعض یورپی لباس پہنتے ہیں اور بعض پہلے کی طرح کا وطنی لباس۔ بعض اپنے بچوں کی جدید ترین طریقے پر تربیت کرتے ہیں۔ اور بعض تربیت کے معاملے میں اوہام و خرافات سے کام لیتے ہیں اور اس طرح ان کی زندگی مجموعۂ تضاد بن گئی ہے۔ جس کے نتائج ایک دوسرے سے برعکس نکلتے ہیں۔ اب اگر حقیقی اصلاح مقصود ہے تو ضرورت ہے کہ یہ کام تجربہ کار مصلحین کے ہاتھ میں دیا جائے جو یہ جانتے ہوں کہ کون سی چیزیں ایک دوسرے سے ہمنوا ہو سکتی ہیں اور کون سی چیزیں ایسی ہیں، جو باہم نہیں مل سکتیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو مجھے پوری امید ہے کہ یہ مصلحین اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوں گے۔

اس کے علاوہ بعض اور امور ہیں جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ مصلح اور ریفارمر کی ایک آنکھ تو اس امر پر ہونی چاہیئے کہ وہ قدیم اور جدید تہذیب سے کیا اخذ کرے اور دوسری آنکھ سے اپنے ملک کے حالات اور اس کے طبعی اور اجتماعی ماحول پر رکھنی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک قوم کے لئے مناسب ہو اور دوسری قوم کے لئے یہ

مناسب نہ ہو چنانچہ ایک چیز مغرب کے لئے مناسب ہو سکتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ مشرق کے لئے بھی مناسب ہو۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو ناکامی و شکست یقینی ہے۔

میری آنکھوں کا دیکھا ایک واقعہ ہے کہ ایک دوست پرانے گرم کپڑوں کو نئے بنانے کا طریقہ سیکھنے کے لئے انگلستان گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں پرانے گرم کپڑوں کو ایک مشین میں ڈال دیتے ہیں۔ اور اس میں کچھ کیمیاوی مسالوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ کپڑے دُھل دُھلا کر صاف نکل آتے ہیں۔ اور پھر ان کو جیسا رنگنا ہو، رنگ لیا جاتا ہے۔ اور وہ نئے کپڑوں کی طرح مگر سستے بیچ دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے اس دوست نے انگلستان میں یہ سب کچھ سیکھا اور جب وہ واپس مصر آیا۔ تو اس نے وہ تمام آلات منگوائے۔ اور ان کے لئے ماہر کاریگر بھی مہیا کئے اور جیسے یورپی ماہر کام کرتے تھے ویسے وہ بھی کام کرنے لگے۔ لیکن اس کا یہ کام چل نہ سکا۔ اور وہ ناکام ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سلسلہ میں اس نے ضروری باتوں کا خیال نہ رکھا۔ ایک یہ کہ وہ اس بات کو بھول گیا کہ انگریزوں کے ہاں ان کی سرد آب و ہوا کی وجہ سے گرم کپڑے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور مصر کی آب و ہوا چونکہ گرم ہے اس لئے وہاں گرم کپڑے کم ہوں گے۔ اور دوسرے یہ کہ انگریز جب گرم کپڑے اتارتے ہیں تو ان میں کچھ نہ کچھ جان ہوتی ہے۔

اس کے برعکس مصری صرف اسی وقت پرانے کپڑے اتارتے ہیں۔ جب وہ بوسیدہ ہو چکتے ہیں۔ چونکہ دونوں ملکوں کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے ناکامی لازمی تھی۔

اب اگر دوست نے اس کام کے ہر پہلو پر غور کر لیا ہوتا۔ تو وہ کبھی اس کام کو مصر میں شروع نہ کرتا۔ کم و بیش یہی حالت ہمارے مصلحین اور ریفارمروں کی ہے۔ ان کی نظروں سے زمان و مکان کے سلسلے کی بعض باریک باتیں مخفی رہتی ہیں۔ اس لئے وہ اس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اگر وہ اخذ و انتخاب کی صحیح سوجھ بوجھ رکھتے ہوں۔ اور اچھی چیزوں کا انہیں پورا علم ہو۔ اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا ہو۔ تو وہ کبھی ایک ایسی چیز کا رشتہ دوسری چیزوں سے نہیں جوڑیں گے۔ اگر وہ ان سے میل نہ کھاتی ہو۔

قوموں کی اصلاح کے کام میں اگر باریک بینی اور غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس میں ناکامی کی کوئی وجہ نہیں دکھائی دیتی اور یوں تو کامیابی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔